عالم خوند میری

انسانی تقدیر اور وقت

اقبال کی نظر میں

مشرق کے مفکروں اور شاعروں میں اقبالؒ شاید پہلا شخص ہے جس نے انسانی تقدیر اور وقت کے ربط کو اپنی فکر اور شاعری میں مرکزی اہمیت عطا کی۔ یوں تو انسان کی تقدیر کا مسئلہ ہمیشہ سے مشرق کے فلسفیوں، اہل نظر صوفیوں اور فکر پسند شاعروں کا مرکز توجہ رہا ہے، لیکن مشرق کی عام روایت یہ رہی کہ انسانی تقدیر کو وقت اور تاریخ سے اس حد تک ماورا تصور کیا جائے کہ جیسے تاریخ اور وقت کی پرچھائیں انسانی تقدیر پر پڑتی ہی نہیں۔ مشرق کی اس روایت میں اہمیت اس بات کو حاصل رہی کہ انسانی شخصیت کو ازل اور ابد کے قطبین سے مربوط کیا جائے اور ان قطبین کے درمیانی حصے کو جو وقت اور تاریخ کا میدان ہے، انسانی ماہیت کے نقطہ نظر سے یا تو بے معنی اور لغو قرار دیا جائے یا پھر اس حصے کو قانونی اور سیاسی اصولوں (اسلامی روایت میں شریعت کا روایتی مفہوم اور ہندو روایت میں دھرم کا جابرانہ تصور) کا تابع بنا دیا جائے۔ اس روایت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی شخصیت کے افقی اور عمودی ابعاد میں بامعنی ربط قائم نہ ہوسکا۔ مشرقی فکر میں اقبال کی معنویت اور عصریت کا راز یہی ہے کہ اس نے

انسانی وجود کے ان دونوں ابعاد کے تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی اور تقدیر (Destiny) اور وقت کے ربط کو اس انداز سے پیش کیا کہ انسانی شخصیت جبر سے محفوظ رہے اور تخلیقی آزادی کے جوہر سے استفادہ کرنے کے موقف میں رہے کیونکہ تقدیر اور وقت (تاریخ) کو مربوط کرنے میں جبریت کا خطرہ فکر کو ہمیشہ درپیش رہتا ہے۔ یہ بھی اقبال کا ایک اہم فکری اور تخیلی کارنامہ ہے کہ اس نے نہ صرف اس خطرے کو محسوس کیا بلکہ اس میں گھر جانے سے محفوظ رہا۔

اقبال کو اس امر کا امتیاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف ایسے اعلیٰ تر شعری کشف (Vision) کا حامل تھا جس کی بناء پر وہ حقیقت کو منطقی امتیازات سے ماورا دیکھ سکتا ہے۔ (اس طرح نہیں کہ زیست کی سطح پر بھی یہ امتیازات بے معنی بن جائیں) بلکہ اس کی فکر میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ حقیقت کے اس کشفی مشاہدے کو اپنا موضوع بنائے۔ اس طرح اس کے اظہار میں بیان اور تعبیر دونوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ ایک فلسفی کی حیثیت سے اقبال نے وقت کی معنویت کو محسوس کیا بلکہ شاعر نے فلسفی کو وقت اور تغیر کا رمز آشنا بنایا اور یہی شاعرانہ کشف اقبال کو مشرق کی شعری روایت میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

یہ عقیدہ کہ وقت غیر حقیقی ہے اور تاریخ بے معنی' مشرقی فکر کا ایک پیش مفروضہ رہا ہے۔ باطنی اور سری روایت' جس نے اردو اور فارسی کے بیشتر شاعروں کو متاثر کیا' اس عقیدے کو استحکام عطا کرتی رہی اور جیسا کہ مک ٹگارٹ (McTaggart) نے اشارہ کیا ہے' (1) سریت (Mysticism) ہمیشہ وقت کی حقیقت کے تصور سے رو گرداں رہی۔ یہ بات ایرانی اور ہند اسلامی روایت اور خصوصاً شاعرانہ روایت پر بڑی حد تک صادق آتی ہے۔ ہندوستانی تصوف میں' شاید ہندی سریت کے زیر اثر جس کا ایک محرک تصور وقت سے

فرار رہا ہے' وقت سے بے نیازی کا احساس نمایاں تر رہا۔ ہندی فکر عام طور پر غیر تاریخی رہی ہے۔ ہند کی فلسفیانہ اور فن کارانہ روایت میں تاریخی وقت عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ وقت کا دوری تصور' جو مشرق کے شعور وقت کا غالب رجحان رہا ہے' زمانے میں انسانی ترقی کے تصور کو قبول نہیں کرسکتا' اور نہ ہی یہ تصور نمو کے رجحان سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔ وقت سے روگردانی کا یہ رویہ اگر ایک طرف اس جذبے کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ انسان اس زمین پر اپنی تکمیل کے اسباب فراہم کرے تو دوسری طرف نجات کو ایک طرح کے عدم یا انسانی شخصیت کی کامل نفی اور فنا کے مرادف قرار دیتا ہے۔ فارسی کی کلاسیکی شاعری کا مرد دانا جو ایک اعتبار سے اس اجتماعی لاشعور کا ایک آرکی ٹائپ ہے' وقت سے فرار میں ایک نوع کا روحانی سرور محسوس کرتا ہے اور "مے و بادہ" وقت سے فرار کی خوبصورت علامت بن جاتی ہیں۔ صرف حافظ کی شاعری میں زندگی سے تھکن کے احساس کے باوصف وہ عظیم شعری لمحہ رونما ہوتا ہے جو اس کی پرکیف جمالیاتی سپردگی کے رویے کا نتیجہ ہے اور یہی جمالیاتی سپردگی' حافظ کو دوسرے صوفی شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ یہاں فنا کی بجائے روحانی سرور اور جمالیاتی کیف کی فضا بے پناہ انداز میں فن کارانہ شعور پر چھا جاتی ہے۔

حافظ کی اس جمالیاتی سپردگی اور دوسرے صوفی شعرا کے نفی ذات کے جذبے کے درمیان ہمیں ایک اور لمحہ نظر آتا ہے جس کو ہم وفور کے لمحے سے تعبیر کرسکتے ہیں (اور جو یونانی (Dionisian) محرک کے قریب ہے) وفور کا یہی لمحہ رومی کی شاعری کا مستقل وصف بن جاتا ہے جو ایک بے تاب آرزو اور شوق فراواں کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔ اس بے تاب آرزو کا کمال یہ ہے کہ وہ وجود اور حیات کے ازلی سرچشمے سے انفرادی زیست کو قریب تر کرلے۔ یہاں وصل' فنا نہیں بلکہ بقائے دوام ہے۔ کمال کا یہی لمحہ انسان کا مثالی مستقبلی لمحہ ہے اور یہی انسان کی اصلی تقدیر۔ تمنا کے اس لمحہ میں یقیناً حادثات کی اس

دنیا سے فرار کا جذبہ پنہاں رہتا ہے لیکن یہ فرار ایک بے رحم وقت کے تباہ کن سیلاب سے گھبرائی روح کا فرار نہیں ہے بلکہ یہ ایک روحانی سفر ہے جس کے طے کرنے کے لیے انسان کو اپنی تمام روحانی اور فطری توانائی کو اکٹھا کرنا ہوتا ہے۔ یہ وہ سفر ہے جس کے لیے انسان میثاق ازل کے لمحے پابند ہوا تھا۔ یہ جذبہ' انسانی روح کو تھکاتا نہیں بلکہ دقیقوں اور ساعتوں کی سست رفتار دنیا سے اس کو دل گرفتہ کر دیتا ہے۔ رومی کے اس شعر میں ۔

زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

آرزو کا لفظ' ایک ایسے مستقبل کی جانب اشارہ کرتا ہے جو حال کے لمحے سے اور عام انسانی ماضی سے یکسر مختلف ہے۔ اس نوع کے تجربے میں وقت' ایک معنویت اور اہمیت اختیار کر لیتا ہے اور ایسا صوفی اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے جس میں ٹی ایس ایلیٹ کے الفاظ میں وقت پر وقت کے وسیلے سے کامرانی حاصل ہوئی ہے۔ اس تجربے میں عشق کا حرکی اصول خضر راہ بنتا ہے' جس کی رہنمائی میں روح کا عمل کیمیا وقوع پذیر ہوتا ہے۔ سالک اپنے آپ کو ایک ایسے روحانی عالم میں سفر کناں پاتا ہے جو ہندی عارف کے سفر سے مختلف ہے جہاں "فکری مراقبہ" سفر کی منزل ہے۔ براؤن (2) کے الفاظ میں اسی منزل پر تصوف کا جذباتی کردار جو ہندی فلسفیوں کی بارد اور بے سوز دنیا سے مختلف ہے' نمایاں ہو جاتا ہے لیکن اس جذباتی حرارت اور وفور شوق کی گونج ہمیں اردو کی صوفیانہ شاعری میں یا تو سنائی نہیں دیتی یا پھر یہ ایک ایسا استثنائی لمحہ ہے جو توجہ کو شدت کے ساتھ مائل نہیں کرتا۔ رومی اور عطار کی حرارت اور شوق بے پایاں کے برخلاف ہمیں' یہاں وہ فضا نظر آتی ہے جو افسردگی اور تھکن کی مرادف ہے۔ خود شعر ذریعہ نجات بن جاتا ہے اور دوسرے تمام روحانی عناصر' علامتی قدر اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کی رائیگانی

اور بے ثباتی کے تصور شاعری کا غالب محرک بن جاتے ہیں اور یہ عالم کائنات ایک ایسے مسافر خانے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جہاں سالک کو صرف ایک رات کے لیے مقام کرنا ہے۔

یہ بات یقیناً صحیح ہے کہ زندگی کی بے ثباتی اور رائیگانی کا خیال مذہبی شعور کا ایک لازمی عنصر ہے لیکن یہاں جس امر کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ جس انداز سے ہند اسلامی فارسی اور اردو شاعری میں اس خیال کو پیش کیا گیا ہے' وہ ایک گہرے اور بامعنی مذہبی شعور سے عاری نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف یہ تصور اس پیغمبرانہ جذبے کی نفی کرتا ہے جو تمام انبیا کا غالب محرک تھا اور جس کا مقصد پورے انسانی موقف کو تبدیل کرنا تھا جس میں انسان کا ارضی موقف بھی شامل تھا۔ان تصوف مائل شاعروں کی نیت کتنی ہی عظیم کیوں نہ رہی ہو' ان کی فنی تخلیق نے جو فضا فراہم کی وہ تغیر اور تبدیلی کے پیغمبرانہ جذبے کی بہرحال نقیض رہی۔ حافظ کی شاعری کا یہ لمحہ۔

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کسے نکشود و نکشاید' بحکمت ایں معمہ را

اردو کی تصوف مائل شاعری کا غالب رجحان بن گیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کم از کم حافظ کے شاعرانہ جذبے میں زیست کی تشویش اور تردد کے عناصر شامل تھے۔ لیکن دور انحطاط کے اردو شاعروں میں رسمی عنصر اس حد تک غالب ہو جاتا ہے کہ نتیجہ صرف ایک روحانی طلسم کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ہند اسلامی شعری روایت میں غالب شاید پہلا شاعر ہے جس کی شاعری میں ایک واضح فکری رویے کے ساتھ ہمیں تمنائی اور مستقبلی عناصر نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں۔ (3) یہ بات معنی خیز ہے کہ اقبال نے اپنی ایک ابتدائی نظم میں غالب کو گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا تھا۔ یقیناً ان دونوں میں ایک روحانی رشتہ ہے اگر "سعی بے قرار" گوئٹے کے پاس بذات خود ایک قدر ہے تو

سعی لاحاصل غالب کے لیے سامان لذت ہے۔ یہ تمثیل ایک علامتی قدر کی حامل ہے۔ اقبال اپنے اولین دور ہی میں یورپ کے ارادی فلسفیانہ رویے سے متاثر تھا جس کی بہترین مثالیں اس نے گوئٹے اور نطشے کے ادبیات میں حاصل کیں لیکن ایک مستند شاعر کی حیثیت سے اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اس رویے کا سراغ خود اپنی روایت میں پانے کی کوشش کرے اور اسی جستجو میں اس نے رومی اور غالب کی دریافت کی۔ ان شاعروں کے جس عنصر نے اسے اکسایا وہ ان کا کبھی مخفی اور کبھی ظاہر (Faustian Promithius) رجحان تھا۔ مشرق میں جس کا پرجوش نغمہ خواں وہ خود بننے والا تھا۔

اسی "فاؤستی روح" کا ایک نمایاں رجحان وقت اور انسانی تقدیر سے جذباتی وابستگی ہے اور یہ عقیدہ کہ وقت' تبدیلی اور تغیر کا حامل ہے اور انسانی تقدیر نہ صرف تبدیلی کی صلاحیت رکھتی ہے بلکہ انسانی شخصیت خود تقدیر ساز ہے' گوئٹے نے ایک معنی خیز اعلان کیا تھا کہ وقت اس کا میدان ہے (Time is his field) اور اقبال نے محسوس کیا کہ وقت اس کے لیے موت اور زیست کا مسئلہ ہے۔ وقت کے ساتھ اس کے لگاؤ میں اقبال کا محرک صرف مذہبی یا صوفیانہ نہیں ہے بلکہ اس کے محرکات زیادہ گہرے ہیں اور وہ انسانی وجود اور تقدیر سے وابستہ ہیں۔ اس کے ذہن کا ایک اہم سوال انسان کے وجودی منصب (Ontological Vocation) سے متعلق ہے اور اقبال کا جواب یہ ہے کہ انسانی وجود' اپنے پورے موقف میں تغیر یا تبدیلی کا جویا ہے۔ انسان نہ صرف خود اپنی تقدیر کا خالق ہے بلکہ اسی تخلیقی عمل کے دوران اپنی انسانی ماہیئت کا تحقق کرتا ہے۔ انسانی ماہیئت اس کی نظر میں' صرف عمل نہیں ہے بلکہ انقلابی اور تغیری عمل ہے۔ وہ صوفیانہ وجدانی تجربے کی قدر و قیمت کا تعین بھی اسی معیار سے کرتا ہے کہ یہ تجربہ کہاں تک انسانی موقف میں انقلابی تبدیلی کا محرک بنتا ہے۔ یوں تو انبیاء اور اولیاء دونوں وجدانی تجربے کے سرور

سے سرشار ہوتے ہیں لیکن جہاں اول الذکر صرف اپنی نفسی حالت میں انقلاب بپا کرتے ہیں، وہیں آخر الذکر اپنی اس منقلب نفسی کیفیت کو مجموعی انسانی موقف اور تاریخ میں تبدیلی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اسی لیے اقبال کی نظر میں پیغمبرانہ تجربہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں تک ولی کا تعلق ہے، اس وجدانی تجربے کا اثر یہ ہے کہ اس کا وجود گم ہو جاتا ہے یا وہ اپنے وجود کو غالب کے لفظوں میں گم کیا ہوا پاتا ہے لیکن پیغمبر تبدیلی اور تغیر کا سبب بنتا اور تخریب اور تخلیق کے عمل کا حامل بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پیغمبرانہ مثال کے لیے اقبال کا جذبہ اس کے احیاء پسندانہ رجحان کا عکاس نہیں ہے بلکہ یہ اس امر کا مظہر ہے کہ اقبال وقت کو اور اس کے عمل کو صوفی کی سکوں پرور ابدیت پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ تکوین اور تغیر کے عمل میں حقیقت کی تلاش کرتا ہے اور حقیقت کی تلاش غیر تبدیلی پذیر وجود میں نہیں کرتا۔ وہ روایتی سکوت پرور ذہن کے برخلاف سعی مسلسل کے وجود کے مفہوم کا حامل قرار دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر جدید ترکی تلاش میں تاریخ کے ہنگامہ خیز بہاؤ میں کود پڑنے کو ترجیح دیتا ہے جسے وہ شاعرانہ زبان میں عشق کی جست کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے اقبال مشرق میں جدیدیت (Modernity) اور عصریت کی آواز بن جاتا ہے۔

جدیدیت (4) کے چند اہم عناصر، وقت کے اصول کی اہمیت، تبدیلی اور تغیر کی وجودی قدر و قیمت اور ابدیت کے بے زباں اصول کے مقابلے میں تاریخ کے معنویت پر مشتمل ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک گہرے تاریخی شعور کے بغیر "وقت" ایک بے سمت بہاؤ اور دوران (Duration) ایک بے متن عمل بن جاتا ہے جہاں تک "وقت" کی معنویت اور اہمیت کے رجحان کا تعلق ہے، اس بات میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ یہاں اقبال برگسوں سے بے انتہا متاثر ہے لیکن اقبال کی وابستگی صرف "وقت" کے اصول سے نہیں

ہے بلکہ وہ تاریخی عمل سے بھی مساوی حد تک دل بستگی رکھتا ہے اور یہیں اقبال اور برگسوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں اور اقبال یورپ کی جرمن روایت سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ جہاں تک وقت کی ماہیت کا تعلق ہے اقبال برگسوں سے متفق ہے کہ زمان اصلی دوران ہے اور عرف عام کا وقت اس دوران کی تجرید ہے۔ اقبال اور برگسوں دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ ہم جسے وقت کا نام دیتے ہیں اس کی تشکیل میں مکان کا اصول بڑی حد تک کارفرما رہتا ہے۔ یہاں وایٹ ہیڈ بھی مجموعی طور پر برگسوں سے متفق ہے لیکن برگسوں اور اقبال کا گہرا تقابلی مطالعہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ان دونوں میں بعض اہم اختلافات ہیں۔ ایک حیاتیاتی مفکر کی طرح برگسوں' تکوین کے عمل میں اس لیے دلچسپی رکھتا ہے کہ اس عمل کے دوران "جدید" ابھرتا ہے اور اسی لیے وہ اس بات پر مصر ہے کہ مستقبل کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ نظریاتی سطح پر برگسوں کا وقت کے بارے میں نقطہ نظر آزادی کو جبر کے حملے سے محفوظ رکھتا ہے لیکن وقت کی مجموعی معنویت کی مکمل تصویر پیش نہیں کرتا۔

وقت پر سنجیدگی سے غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم وقت کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کریں۔ "وقت" کے تین اہم معنی خیز رخ ہیں۔ تکوین' دوران اور دوام (جس کی وسیع تر صورت ابدیت ہے) اور یہی تین رخ وقت کے تین ادوار' حال' ماضی اور مستقبل کو معانی عطا کرتے ہیں۔ اگر وقت محض تکوین ہے تو پھر ماضی بے معنی بن جاتا ہے۔ یہ صرف وقت بااعتبار دوراں کا نتیجہ ہے کہ گزرا ہوا وقت' گزرتے ہوئے وقت سے مربوط ہوتا ہے لیکن اگر وقت صرف دوران ہے تو پھر ماضی اور مستقبل کے امتیازات اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔ یہ "دوام" کا نتیجہ ہے کہ مستقبل اور ماضی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ جب ہم "دوام" کو ابدیت کے مفہوم میں دیکھتے ہیں تو وقت بحیثیت دوراں بے پناہ امکانات کا حامل نظر آتا ہے' اسی طرح دوران' تکوین کی حیثیت

سے حقیقی تبدل اور تغیر کا مفہوم حاصل کرلیتا ہے' قدر آفرینی کے نقطہ نظر سے وقت کے یہ تین پہلو تخریب' تحفظ اور تخلیق (Destruction, Conservation, Creation) کے ہم معنی بن جاتے ہیں۔ تخریب کا عمل (دوسرے لفظوں میں قہاری) اس لیے حقیقی ہے کہ تکوین بھی ہے اور تخلیق اسی وجہ سے ممکن ہے کہ وقت ابدیت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور تخلیق ایک ابدی نظام کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔

(غالب کے الفاظ میں' آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز: پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں' اور اقبال کی علامت میں' یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید: کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں)

وقت کے بارے میں اس بحث میں ایک اہم نکتے کو فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ انسانی وجود ہی ہے جو وقت کا وجدان حاصل کرتا ہے۔ ماضی' مستقبل اور حال ایک غیر انسانی دنیا میں کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔ انسانی شعور کی غیر موجودگی میں عالم محض تغیرات کا ایک سلسلہ ہے۔ تغیر' تکوین کا مفہوم صرف اسی عالم میں حاصل کرتا ہے جو انسانوں سے آباد ہے۔ یہ بات صرف انسانی دنیا ہی میں ممکن ہے اور انسانی سعی ہی اس امکان کی ضامن ہے کہ تخریب' تحفظ اور تخلیق تاریخی عمل میں ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔ اقبال کا یہ ایک اہم فکری شعری کارنامہ ہے کہ اس کے کشف وقت میں وقت کے سارے پہلو ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔

شاعری کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے اس امر سے واقف ہیں کہ وقت کا تخریبی پہلو یعنی عمل تکوین کا منفی انداز شاعر کے حساس شعور کو اس کے تخلیقی یا دوامی رخ کے مقابلے میں زیادہ شدت سے ساتھ متاثر کرتا ہے۔ شیکسپیئر (5)نے بڑی شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کیا تھا کہ کوئی چیز وقت کی تلوار کے خلاف اپنی مدافعت نہیں کرسکتی۔ اس کے وجدان نے ہر چیز کو وقت

کے خلاف برسرپیکار پایا۔ اقبال کی شاعری میں بھی وقت کا پہلا عرفان' ایک المناک احساس کا حامل ہے کہ عالم فطرت میں کسی شے کو دوام نہیں حتیٰ کہ حسن بھی عارضی ہے۔ یہاں روایتی نو فلاطونی تصور کو جو بیشتر اردو' فارسی شاعروں کا مشترک ورثہ ہے ایک ٹھیس پہنچتی ہے۔ اقبال کی شاعری کے درمیانی دور کی ایک معنی خیز نظم "حقیقت حسن" میں حسن خدا کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے۔ اس نظم کے ساتھ اقبال کی شاعری میں ایک نیا محرک داخل ہوتا ہے' یعنی محاورہ بین خدا و انسان اور بالآخر یہ محرک اقبال کی شاعری میں بار بار ابھرنے لگتا ہے۔

اقبال کے شعری سفر میں یہ نظم ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کے پس منظر میں پرشکوہ عالم فطرت کا وجود محسوس ہوتا ہے جہاں کائناتی وقت کی حکمرانی ہے جس میں لمحات کا عبور' جو انسانی وقت کا ایک خاصہ ہے' مفقود ہے۔ لیکن شاعر کا تخیل کائناتی اور انسانی وقت کی اس خلیج کو پاٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ جوں ہی خدائی کلمات ادا ہوتے ہیں' ستارے بھی جو بظاہر ابدیت کے حصہ دار دکھائی دیتے ہیں' عدم کے خوف سے سہم جاتے ہیں۔ ہر چیز کو نگل جانے والا وقت حسن پر بھی شفقت نہیں کرتا۔ وقت کا یہ بے رحم برتاؤ مستقبل کو فکر اور تردد سے معمور کر دیتا ہے اور اس لمحہ یہ سوال ابھرتا ہے کہ وقت کے اس تخریبی اور ماہرانہ پہلو پر فتح کیسے حاصل کی جائے؟ کیا فطرت کسی شے کا تحفظ بھی کرتی ہے؟ گوئٹے نے محسوس کیا تھا کہ یہ بات کہ فطرت اعلیٰ تر روحانی توانائیوں کو فنا ہو جانے دے گی قطعاً" خارج از بحث ہے۔ (6) فطرت ایسے سرمایہ کو اس طرح برباد نہیں کرتی۔ دوسرے دور کی ایک نظم "طلباء علی گڑھ کالج کے نام" میں اقبال دوام اور بقا کے امکان کے کربناک سوال کا ایک جواب پا لیتا ہے اور جس کے جواب کے پوشیدہ امکانات تدریجی طور پر اس کی شاعری اور فکر میں تفصیلی طور پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وقت کے تخریبی عمل پر فتح پانے کا راز خود انسانی شخصیت کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ ذوق طلب اور سوز ہی

شرط دوام ہیں:

موت ہے عیش جاوداں، ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

جیسے جیسے اس کا شاعرانہ شعور پختہ ہوتا ہے، یہ خیال کہ عشق اور سوز ہی دوام کے ضامن ہیں، اقبال کی شاعرانہ فکر میں مرکزیت حاصل کر لیتا ہے۔ قدیم ہند کے فن کارانہ طلسماتی تخیل نے رقص شیو کی علامت میں اس کائناتی صداقت کو پیش کیا تھا کہ تخریب اور تخلیق ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ زرتشتی رمزیت میں بھی زروان جو کائناتی وقت کا رمز ہے، خلق اور فنا دونوں کا ذمہ دار ہے اور یہی زروان کائناتی عمل کا محافظ بھی۔ اقبال نے بھی اس زرتشتی رمز، زروان کو وقت کے تخلیقی، تخریبی عمل کی طاقت ور علامت کے طور پر برتا ہے۔ سفر افلاک کے آغاز ہی پر اقبال کی نظر میں وقت کا راز فاش ہوتا ہے اور وقت اور تقدیر کا ربط منکشف ہوتا ہے، فرشتہ وقت زروان، اس راز کو بے نقاب کرتا ہے۔

گفت زروانم جہاں را قاہرم
ہم نہانم از نگہ ہم ظاہرم
بستہ ہر تدبیر، با تقدیر من
ناطق و صامت ہمہ نخچیر من
غنچہ اندر شاخ می بالد ز من
مرغک اندر آشیاں نالد ز من
دانہ پرواز من گردد نہال
ہر فراق از فیض من گردد وصال

ہم عتابے، ہم خطابے آورم
تشنہ سازم تا شرابے آورم
من حیاتم، من مماتم من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حور
آدم و افرشتہ در بند من است
عالم شش روزہ فرزند من است
ہر گلے کز شاخ می چینی منم
ام ہر چیزے کہ می بینی منم
در طلسم من اسیر است این جہاں
از دلم ہر لحظہ پیر است این جہاں

یہاں تک تو وقت اور تقدیر کے ربط پر وقت کی حکمرانی ہے اور زمانی جبر کی فضاء شعور پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ تقریباً یہی فضاء اقبال کی ایک اور مشہور نظم ”نوائے وقت“ میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جاوید نامہ کی منزل پر وقت اور تقدیر کے ربط کا ایک نیا پہلو اقبال پر منکشف ہوتا ہے۔ افلاک کی سیر خود، زمان و مکاں پر انسان کے غلبے کی علامت ہے۔ وقت پر فتح حاصل کرنے کے لیے اس شعور کی بیداری ضروری ہے کہ وقت ایک ناقابل تقسیم عمل ہے۔ ساعتیں اور لمحات وقت کو بانٹتے نہیں، یہ صرف انسانی ذہن کے ادراکی عمل کا ایک رخ ہے پیغمبر نے جو اس رمز سے واقف تھے، وقت پر کامرانی حاصل کی اور تقدیر ساز بھی بنے اور تاریخ کے منقلب بھی۔ اسی لیے اس نظم کے آخری دو شعر زروان کی امکانی شکست کا مژدہ سناتے ہیں:

لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست
آں جوانمردے طلسم من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں

لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

یہ بات اہم ہے کہ اقبال کی نظر میں پیغمبر کی معراج، شعور وقت کے انقلاب اور اس شعور کی توسیع سے عبارت ہے:

از شعور است این کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق

اسی واضح تصور کا اشارہ ہمیں اسرار خودی میں بھی دکھائی دیتا ہے، جہاں اقبال نے مرد حر اور وقت کے ربط پر روشنی ڈالی تھی۔ (7) جاوید نامہ اور اسرار خودی میں اہم فرق یہ ہے کہ اسرار میں اقبال پر نطشے کا اثر زیادہ گہرا تھا اور اسی لیے تقدیر پر فتح کے لیے اس کا تخیل، مستقبل کی ایک نئی نوع کا منتظر تھا، جو راکب تقدیر بن سکتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ایک معنی خیز روحانی اور انسانی انقلاب کے لیے وہ ایک نئی نوع کے ظہور کو ضروری قرار دیتا ہے۔ نئی نوع کا یہ تصور حیاتیاتی نظریہ ارتقاء کی ایک بے جا توسیع ہے، جو شاعرانہ اعتبار سے دل کش سہی لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ نسل انسانی کے لیے اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہو سکتی، جس لمحہ اقبال کے شعری اور فکری وجدان نے انسانی خودی اور وقت کے بہاؤ کے درمیان ربط کو محسوس کر لیا، اقبال کی فکر اس غیر ضروری حیاتیاتی مفروضہ سے آزاد ہو گئی۔ وقت کے بہاؤ اور انسانی خودی میں تضاد کا ایک عنصر پنہاں ہے۔ خود وقت کے اس بہاؤ سے بے نیاز نہیں رہ سکتی کیونکہ وقت کا یہ بہاؤ ایک وجودی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں انسانی تقدیر کے نقطہ نظر سے اہم سوال یہ ہے کہ انسان اس سیل میں دوام کیسے حاصل کرے اور اپنی شخصیت یا خودی کو برقرار کیسے رکھے۔ اقبال اس بات پر مصر ہے کہ دوام، انسان کے تخلیقی امکان کے دائرے میں ہے۔ انسانی خودی وقت ہی میں نمو

حاصل کرتی ہے اور یہی وقت تاریخی زمانے کا بھی سرچشمہ بن جاتا ہے۔ انسانی خودی' وجودی حیثیت سے محدود ہے لیکن نمو کے اعتبار سے لامحدود امکانات کی حامل ہے۔ نمو کا یہ عمل چونکہ اختتام کو نہیں پہنچتا' اسی لیے یہ ابدی ہے اور چونکہ نمو کا عمل وقت میں واقع ہوتا ہے اسی لیے وقت کا دھارا ابدیت سے جا ملتا ہے۔ اس اعتبار سے ابدیت لامحدود امکانات کا دوسرا نام ہے۔ ابدیت زمانے کی نفی نہیں بلکہ ابد خود لامحدود وقت ہے۔ یہ کائنات نامکمل ہے جو اپنے بطن میں نمو کے لامحدود امکانات کی حامل ہے۔ لیکن جہاں تک ان امکانات کے ظہور کا سوال ہے' کائنات اور عالم انسانی میں ایک بنیادی فرق ہے۔ عالم انسانی کے امکانات صرف سعی انسانی ہی سے عالم ظہور میں آسکتے ہیں کیونکہ خود انسان نے اپنے آزاد ارادے سے نیابت کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔

یہاں اقبال اس کی اپنی مذہبی رمزیت کے باوجود مسلک انسانیت کے علم برداروں سے متفق ہے کہ انسان خود اپنی تقدیر کا خالق ہے۔ ہر واقعہ کو دوام حاصل نہیں یعنی یہ کہ ہر واقعہ تاریخ کا جزو نہیں۔ وہی ماضی جو حال کے لمحے کا جزو بننے کی طاقت رکھتا ہے' تاریخ ہے۔ دوام کے مفہوم میں ماضی کے حال میں شامل ہونے اور مستقبل کا عنصر بننے کی صلاحیت دونوں مضمر ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں مرد آزاد ہی کا عمل' دوام کا حامل ہے یعنی وہی انسان اپنی تقدیر کا خالق ہے جو آزادی کے ساتھ اپنے اعمال کی تخلیق کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ صرف آزاد انسان ہی تاریخ بناتے ہیں۔ غلام' اسیر ایام ہیں اور اسی لیے وہ تقدیر کو حادثات کا مرادف قرار دیتے اور ان حادثات کو پہلے سے متعین تقدیر کا عکس تصور کرتے ہیں۔ آزاد انسان تاریخ کے خالق ہوتے ہیں اور اسپنگلر کے الفاظ میں تاریخ ان کا ارادہ ہوتی ہے۔ تاریخ ان کے لیے حادثات کا نام نہیں۔ اقبال شاید عصری جرمن فلسفی ہائیڈ یگر سے اتفاق کرتا کہ تقدیر مستند زیست کی ایک شان ہے اور اسی لیے ہر چیز جو واقع

ہوتی ہے تقدیر نہیں رکھتی۔ (8) جس لمحہ انسان شے بن جاتا ہے' اپنی تقدیر کو کھو بیٹھتا ہے اور صرف آزاد عمل ہی سے اپنی تقدیر پالیتا ہے۔ آزاد ارادے کا عمل ہی تاریخی عمل ہے اور اسی تاریخی عمل میں انسان خود اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ ایسا ماضی جو کسی بھی فرد کے شعور کا حصہ نہیں' وہ تاریخ کا بھی ماضی نہیں۔ اقبال نے وقت کے اس پہلو کی انتہائی فن کارانہ تصویر اپنی لازوال نظم "مسجد قرطبہ" میں پیش کی ہے۔ اس مسجد کی سیر' اس کو ایسے ماضی میں غوطہ زن ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے جو خود اس کا ماضی ہے۔ اس کی زندگی کا یہ لمحہ تاریخ کو محض وقوفی طور پر یاد کرنے کا لمحہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جس میں ماضی زندہ ہو جاتا ہے۔ وہ ذہنی دیوار جو ماضی کو حال سے جدا کرتی ہے ٹوٹ جاتی ہے اور حال ماضی سے اس حد تک قریب ہو جاتا ہے کہ ماضی' حال کا تسلسل بن جاتا ہے اور پھر اقبال کا تخیل ایک ایسے مستقبل کی جانب پرواز کرتا ہے جو ایک زندہ' توانا اور تاریخ کے شعور کے حامل انسانی گروہ کا منتظر ہے جو اپنے طاقتور عمل سے اس مستقبل کو حال کی صورت عطا کرسکتا ہے۔ مسجد قرطبہ' شاعر کے لیے اسپنگلر کے الفاظ میں ایک مختتم مکان نہیں بلکہ اس کے تخیل کے لیے تکوین پذیر وقت کا ایک نمو پذیر واقعہ ہے۔ ماضی ایک ایسے مستند حال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جس کو ہائیڈیگر نے "کشف کے لمحے" سے تعبیر کیا تھا۔ اگر تمام حادثات کا سرچشمہ سلسلہ روز و شب ہے' تو ظاہر ہے کہ موت ہی حادثات کے اس سلسلہ کا انجام ہے۔ کائنات کا کوئی مظہر موت و حیات کے اس نظام سے مستثنیٰ نہیں۔ جب کار جہاں بے ثبات ہے تو معجزہ ہائے ہنر بھی آنی و فانی ہیں اور صرف ایک مستند شخصیت (مرد خدا) کی تخلیق ہی وقت کے اس بہاؤ کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اس پر موت کا سایہ نہیں منڈلاتا' اس لیے کہ عشق اس تخلیق کا محرک ہے اور خون جگر سے اس کی نمود ہوئی ہے۔ عشق ہی حال کے لمحہ فانی سے انسانی تقدیر کو بلند کرسکتا ہے۔ عشق ہی کو دوام ہے اور

عشق ہی میں دوام کا راز ہے۔ ایسا ہی ایک کارنامہ " ہے" اور "تھا" کی قیود سے آزاد ہے۔ نظم کا انجام:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اس امر کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ "دوام" حاصل کرنے، تاریخ کا حصہ بننے اور تقدیر کی منزل تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ایک ایسا استناد (Authenticity) ہے جہاں تک رسائی اسی شخصیت کو حاصل ہو سکتی ہے جس نے وقت کے بہاؤ پر قابو پا لیا ہے۔ "دوام" اور "دوران" میں ایک اندرونی ربط ہے جو دوران کا سرور حاصل کر سکتے ہیں۔ انہی کے نصیب میں دوام بھی ہے اور تاریخ بھی۔ تقدیر کا مالک ہونا موت پر قابو پانے کے مترادف ہے۔ موت پر فتح، موت سے گریز پر نہیں بلکہ حال کے لمحے سے بلند ہونے اور عمل کے ذریعہ وقت کے ریگ زار پر اپنی زیست کی مہر ثبت کرنے پر مبنی ہے۔ یعنی تقدیر کا حامل ہونا اور تاریخ کا حصہ بننا ایک ہی عمل کے دو رخ ہیں۔ اسی شاعرانہ خیال کو اقبال نے اپنے خطبات میں واضح تر انداز میں پیش کیا ہے کہ " حیات دوام" ایسی تقدیر (Destiny) جس کو حاصل کرنا ہر ایک کی قسمت (Fate) نہیں۔ اگر انفرادی بقاء ایک حق نہیں ہے بلکہ شخصی محنت کا نتیجہ ہے تو ظاہر ہے کہ "تاریخیت" اور "تقدیر" میں ایک قریبی رشتہ ہے۔ بقائے دوام، وقت کا ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ وقت کا ایک مختلف اظہار ہے۔ جس شے کو ہم ابدیت کہتے ہیں وہ مستقبلیت (Futurity) ہے اور ابدی مستقبل ایسا بے زماں تسلسل نہیں جس میں کوئی واقعہ نہ ہو بلکہ شخصیت کے لامحدود عروج کا دوران مسلسل ہے۔

اس بحث سے ایک اہم نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انسانی شخصیت اور وقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور "تقدیر" وقت کے نظام کے باہر نہیں بلکہ وقت

کے نظام ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ کوئی تجربہ ایسا نہیں جو وقت کے باہر ہو۔ یہ ضرور ہے کہ وقت کی کئی ایک سطحات ہیں اور وقت کے تجربے کے کئی ایک پہلو ہیں۔ اعلیٰ ترین وجدان بھی وقت کے نظام سے ایک رشتہ رکھتا ہے۔ تاریخ خود وقت کا ایک نظام ہے اور جہاں تک انسانی تقدیر کا تعلق ہے، تاریخ سے اس کا قریبی ربط ہے۔ وہی جو ایک نظام حیات کو بدل سکتے ہیں، تقدیر رکھتے ہیں اور جو نظام حیات کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں، تاریخ ساز بھی ہیں اور خود تاریخ بھی (World-Historical)

اقبال کے ان افکار پر تنقید کی کافی گنجائش ہے، اس کی فکر میں عام انسان کے لیے کوئی مقام نہیں۔ یہاں ہم حافظ کی اس دنیا کا تجربہ حاصل نہیں کرتے جو فن اور حسن کے اندر ڈوب جانے کا نام ہے۔ اقبال کی فکر، ایسے ہی افراد کے لیے ہے جو واقعی شخصیت کے حصول کے طلب گار ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اس کے مے خانے میں گنجائش نہیں جو ازل کا سرور حاصل کرتے رہتے ہیں اور جنھیں ابد کی فکر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ازل کے سرور سے ابد کا تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے جہاں اقبال کی قدر شناسی ضروری ہے وہی اقبال کو معیار بنانا، نظر کو محدود کرنا ہے۔ اقبال بیسویں صدی کی مستند آواز ہے۔ وہ ایک اعتبار سے نطشے اور مارکس کا رفیق ہے جن کے لیے سب سے اہم مشغلہ، انسان کی تقدیر کو بدلنا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے اس آخری دور میں حساس ذہن یہ پوچھ سکتا ہے: کس کے بس میں ہے کہ انسان کی تقدیر بدلے؟ لیکن اس عظیم مایوسی میں اقبال کی یہ صدا: "یزداں بکمند آور، اے ہمت مردانہ" حق پسندوں کو شہادت کے لیے اکساتی ہے۔

حوالے اور اشارے

۱۔ McTaggart : Philosophical Studies London, 1934

۲۔ Brown, E.G : Literary History of Persia, London.

۳۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اپنی تصنیف غالب میں اس نوع کے ادب کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو غالب' علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۴۔ یہاں میں نے جدیدیت (Modernity) کی اصطلاح خاص مغربی مفہوم میں استعمال کی ہے۔ اس کا ربط اردو کی حالیہ جدیدیت کی تحریک سے نہیں۔ اس اصطلاح کے بارے میں مغربی تنقید اور فلسفیانہ ادب میں کئی اشارے ملتے ہیں۔

۵۔ Shakespeare : Sonnets xv

۶۔ Goethe : Wisdom and Experience

۷۔ اقبال نے اسرار خودی میں نیابت الٰہی کے تصور پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔

۸۔ Heidegar : Time and Being (English Translation)